بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دعوتِ حق اور اقامتِ دین کی راہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ یہ کام نہ پہلے کبھی آسان تھا اور نہ آج یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اسکے لیے سعی کرنے والوں کو مخالفتوں اور مزاحمتوں سے دوچار نہ ہونا پڑیگا۔ ہم نے جب اس راہ میں قدم رکھا تھا تو کچھ یہ سمجھتے ہوئے نہیں رکھا تھا کہ ہمارے اقدام کا اعلان ہوتے ہی ہر طرف سے خیر مقدم کے نعرے بلند ہونگے اور ایک سہل راستے پر ہم خراماں خراماں بڑھتے چلے جائینگے۔ نہیں، پہلے ہی سے ہم یہ توقع رکھتے تھے کہ مزاحمتیں ہونگی اور شدید مزاحمتیں ہونگی، مخالفتیں پیش آئینگی اور سخت مخالفتیں پیش آئینگی، اس راستہ کا ایک قدم بھی کانٹوں سے زخمی ہوئے بغیر نہ طے کیا جاسکے گا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ جس سمت سے مخالفت کی ابتدا ہوئی ہے اُدھر ہمارا وہم و گمان بھی کبھی نہ گیا تھا، اور ہمارے لیے اب تک یہ بات معمّا بنی ہوئی ہے کہ جس گوشے سے ہم رہنمائی و پیشوائی کے اور بسبیل تنزل تائید و اعانت کے، اور کم سے کم ہمدردانہ سکوت کے متوقع تھے، سب سے پہلے وہیں سے مخالفت کی آواز بلند ہونے کا آخر سبب کیا ہے۔ ہمیں تو امید تھی کہ اسلامی انقلاب کے لیے ایک جماعت کی تشکیل کا نام سن کر کمیونسٹ اور سوشلسٹ کان کھڑے کرینگے، نیشنلسٹ چونکنے ہونگے، فرعونی اقتدار اپنے اسلحہ تیز کریگا، اور مسلمانوں میں سے اگر کوئی گروہ مقابلہ میں اٹھا بھی تو وہ مغربی جاہلیت سے ماؤف لوگوں کا گروہ ہوگا۔ مگر یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ جہاں جہاں سے ہم مخالفانہ پیش قدمی کا اندیشہ

رکھتے تھے وہاں تو ابھی سکون ہے، اور حملہ کا آغاز اُس دیندار گروہ کی طرف سے ہو رہا ہے جس سے ہم اپنے آپکو بالکل مامون سمجھے بیٹھے تھے، اور اس حیرانی پر مزید حیرانی اس بات سے ہوئی کہ دینداروں میں سے بھی خاص طور پر وہ حضرات سامنے آرہے ہیں جو پہلے سے خود بعینہٖ اُسی کام کی ضرورت ظاہر فرما رہے تھے جسے شروع کرنیکا ارتکاب ہم نے کیا ہے، اور جنکی نگاہ میں اس کام کے آغاز سے پہلے تک ہم اہلِ ضلال میں سے نہیں بلکہ اہلِ رشد و ہدایت میں سے تھے۔

یہ پہلا عجیب تجربہ ہے جو ہمیں اس راہ میں پیش آیا ہے۔

اس معاملہ پر ہماری حیرت بالکل فطری ہے۔ ہر شخص کو ایسی صورت میں حیرت ہی ہوگی جبکہ اسکی بستی میں چند دیندار بزرگ ایک مدت سے حج کی تمنا ظاہر کر رہے ہوں اور بار بار کہتے ہوں کہ کاش کوئی قافلہ یہاں سے زیارت کعبہ کے لیے تیار ہوتا، مگر جب چند اللہ کے بندے اسی بستی سے اکٹھے ہو کر قافلۂ حجاج بنانے کھڑے ہو جائیں تو وہی بزرگ سب سے پہلے خطرے کا الارم بجا دیں اور بستی کے لوگوں سے کہنے لگیں کہ ہوشیار رہنا، حج کے نام سے ایک بڑے فتنے کا سامان ہو رہا ہے، حالانکہ حج کا نام لینے سے چند روز پہلے تک یہی حضرات اُن قافلہ بنانے والوں کی نیک نیتی، راستبازی، اور واقفیت راہِ کعبہ پر گواہی دیتے رہے ہوں۔ ہمارے ساتھ بالکل یہی معاملہ پیش آیا ہے اس لیے ہم حیران ہیں اور ہماری حیرانی رفع نہیں ہو سکتی جب تک یہ حضرات ضمنی بحثوں میں بات کو الجھانے کے بجائے اصل مسئلہ پر صاف صاف گفتگو کر کے اپنے طرزِ عمل کے وجوہ بیان نہ کر دیں۔

زیادہ پیچھے جانے کی ضرورت نہیں، ابھی ایک ہی سال پہلے جناب مولانا عبدالماجد صاحب

دریابادی نے آیۂ مبارکہ فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا تھا:-

"یعنی قرآن کے ذریعہ سے جہاد کرو، مقصود اور مطمح نظر قرآن ہی کے قانون کو رکھو، قرآن ہی کو ہاتھ میں لے کر اٹھو، قرآن ہی کی راہ کا سب کو بلاوا دو، اور قرآن ہی کی منزل کی طرف سب کو بلاؤ- اس راہ پر لانے اور اس طرف بلانے میں جدوجہد یقیناً بہت سخت کرنی پڑے گی، جان کھپانی پڑے گی، لیکن راہ ہے یہی، حکم ہے اسی کا ..... اسی مضمون کو مختلف پیرایوں میں اور مختلف عنوانات سے ادا کرنے والی آیتیں دو چار نہیں پچاسوں بلکہ سینکڑوں ہیں- یہ حکم اگر عارضی اور پہلی صدی ہجری یا چھٹی صدی عیسوی کے ساتھ مخصوص تھا تب تو خیر- لیکن اگر آپ کے عقیدہ میں ہر ملک، ہر قوم، ہر زمانہ کے لیے ہے تو آج آپ کیوں قرآنی حکومت کی توسیع و ترویج کے لیے مضطرب نظر نہیں آتے؟ آپکو یہ کیا ہوگیا ہے جو آج آپکے دل میں تڑپ قرآنی حکومت کی عالمگیری کی نہیں؟ ....." (صدق- ۹ر دسمبر ۴۰ء)

پھر چار مہینے بعد آپ نے لکھا:

"مسلمان کا سیاسی آئیڈیل (مطمح نظر) ہونا کیا چاہیے؟ جواب جامع اور دو لفظی صرف ایک ہی ہے، یعنی اسلام کی حکومت، قرآن کی بادشاہت- بس اسکے سوا کوئی اور نصب العین نہ ممکن ہے، نہ اب تک پیش ہوا ہے ..... اس حقیقت کے ذہن نشین ہوجانے کے بعد اُس طبقہ کی غلطی اور غلط روی از خود واضح

ہو جاتی ہے جس نے اس سے کمتر کسی نصب العین پر قناعت کر لی ہے، یا کسی غیر اسلامی حکومت کو تسلیم کر کے اسکے اندر مسلمان نامی ایک قوم کی محض دنیوی سربلندی و خوشحالی کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے ..... سارا غلط مبحث لفظ آزادی سے پیدا ہوا ہے۔ غیر مسلم ہندوستانیوں کے نزدیک اسکے معنی ہیں غیر ملکی حکومت، پردیسی حکومت کے قانون سے مخلصی۔ مسلم ہندوستانی کے نزدیک اسکے معنی وہی ہو سکتے ہیں جو مسلم عرب، مسلم ترک، مسلم مصری، مسلم جاپانی، مسلم انگریز کے ذہن میں ہونگے، یعنی غیر اسلامی نظامت حکومت سے رہائی، خواہ یہ غیر اسلامی حکومت کسی کی بھی ہو، عیسائی کی ہو، یہودی کی ہو، ہندو کی ہو، مجوسی کی ہو، ملحد کی ہو، مشرک کی ہو، محض نام کے مسلمان کی ہو، یا ان میں سے دو یا تین کی مشترک ہو۔ ..... مسلمان کو بیزاری جو کچھ بھی ہے وہ کفر سے ہے۔ انگریز بیزاری، ہندو بیزاری یا کوئی اور بیزاری ہرگز اسکا دین نہیں ..... تو خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کے لیے اپنی ایک مرکزی انجمن پر اتحاد لازمی ہے، خود اس انجمن کی تشکیل صحیح اسلامی طور پر ہونی چاہیے، مقصود اصلی ہر حال میں اعلاء کلمۃ اللہ اور حکومت الٰہی کی عالمگیری رہے۔" (صدق، اپریل ۴۱ء)

پھر ۲۸ جولائی ۴۱ء کے صدق میں آپ نے نازی جرمنی کے بچوں کا طرز تعلیم و تربیت بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"سنتے ہیں کسی زمانہ میں آپ بھی ایسے ہی تھے۔ آپکی زندگی کی غرض صرف ایک تھی، اغراض بصیغۂ جمع نہ تھے۔ مقصد ہستی آپ کا صرف ایک تھا، مقاصد بصیغۂ

جمع سے آپ آشنا نہ تھے۔ آپکا جینا اور آپکا مرنا، آپکا سونا جاگنا، آپکا پڑھنا لکھنا، آپکا ہنسنا اور رونا، آپکی دوستی اور دشمنی، آپکی جنگ و صلح صرف کلمۃ اللہ کی بلندی کے لیے، صرف خدمت دین کے لیے تھی۔ آپ فلسفہ پڑھتے تھے تو اسی لیے کہ مسلمان فلسفی اور متکلم بن کر نکلیں اور سائنس سیکھتے تھے تو اسی لیے کہ مسلم سائنٹسٹ کی حیثیت سے چمکیں۔ ایک دُھن تھی اور ایک تڑپ، اور لگن تھی اشاعت توحید کی، اقامتِ شریعت کی ـــــ کیا اب یہ ناممکن ہے کہ ہم از سر نو ایمان لائیں اور جو کچھ بھی کریں، جو کچھ بھی پڑھیں، جو کچھ بھی سیکھیں، سب کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی تشریح کے لیے، توضیح کے لیے وقف ہو؟"

ایسے ہی خیالات جناب مولانا سید سلیمان ندوی دو تین سال سے مسلسل ظاہر فرما رہے ہیں۔ مثلاً جنوری ۳۹ء کے معارف میں آنجناب نے لکھا تھا:

"ہمارے سامنے اسلام خود ایک بہت بڑی حقیقت اور صداقت ہے۔ وہ مذہب بھی ہے، سیاست بھی ہے، اقتصاد بھی ہے، معاشرت بھی ہے۔ اسکے مذہبی و سیاسی و اقتصادی و اجتماعی پیغاموں کو پھیلانا، مساوات اور عدل قائم کرنا، اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا، دنیا سے سود، بدکاری، شراب خواری، قمار بازی اور ظلم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنا اور ملک میں ایک نیا سیاسی و اقتصادی نظام قائم کرنا اسکے وہ فرائض ہیں جن سے مسلمان غافل ہیں اور غیر مسلمان اسی کے لیے آج دنیا میں کٹ مر رہے ہیں ..... اب یہ خود ہمارا کام ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور اپنا مکمل سیاسی و اقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کریں اور اسکے لیے کم از

کم وہ جذبہ دکھائیں جو اسپین میں جمہوریت اور فسزم کے حامی دکھا رہے ہیں۔ ...

... آج زمانہ بدل گیا ہے تو اصطلاحیں بدل گئی ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے۔ آج پھر اسلام کو اسی فرض کو ادا کرنا ہے۔ اگر آج کے کلمہ گو مسلمانوں میں اسکے اس ادائے فرض کے سپاہی بننے کا ولولہ نہیں تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو زندگی کے میدان میں لائے اور اس سے اسلام کا یہ فرض ادا کرائے۔ ...... دنیا آج اپنی نجات کی راہ فسزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم، بالشوازم میں ڈھونڈ رہی ہے حالانکہ اسکا ایک ہی راستہ ہے اسلام ازم۔ لیکن وہ اسلام وہ نہیں جو آج عملاً مسلمانوں میں ہے بلکہ وہ جو قرآن و سنت میں ہے۔ آج کی وہ کونسی مشکلیں ہیں جنکا حل ان میں نہیں، ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے''

پھر جنوری ۱۹۴۱ء میں آپ نے تحریر فرمایا:

"دنیا میں جو قوم بھی اپنے کو دنیا کی امامت و قیادت کے لیے پیش کرتی ہے وہ جب تک اپنے خون کے سمندر میں خود غوطہ نہیں لگاتی اس منزل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اجتماعی ترقی کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ جہاد ہے، یعنی ہر پہلو کا جہاد، نفس کا جہاد، مال کا جہاد، علم کا جہاد، عقل کا جہاد، جسم کا جہاد اور اس راہ میں جان و مال، اولاد و عزیز اور ہر محبوب سے محبوب اور عزیز سے عزیز متاع کی قربانی۔ ...... یہ تو مطلق جہاد کی راہ ہے۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں جہاد کی منزلیں تو اس سے بھی زیادہ کٹھن ہیں۔ ... جہاں

اپنے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے، خدا کے دین کے لیے اور خدا کے حکم کے لیے
قومیں نہیں، بندے اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں کہ اللہ کی بات کا بول بالا ہو، لِتَكُوْنَ
كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا اور وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ، یعنی دین اور اطاعت
صرف خدا کی ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج ضرورت ہے کہ ہم پھر اپنی آواز بلند کریں اور
تھکی ماندی دنیا کو بتائیں کہ اس کا امن اور چین قومی و نسلی امتیازات اور تفریقوں
میں نہیں بلکہ پیغامِ حق کے قبول میں ہے ۔ پیغامی برادری قائم ہو جس میں اس
پیغام کے ہر قبول کرنے والے کو برابری کا درجہ ملے اور اس پیغام کے مقدارِ
قبول اور اسکے لیے جدوجہد کی ذمہ داری کے قبول کو حقوق کی کمی و بیشی کا
معیار بنایا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ پوری طرح یقین کر لینا چاہیے کہ دنیا
میں کسی پیغام یا کسی تحریک و دعوت کی کامیابی اس پیغام و دعوت کی صرف
عمدگی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اسکے علم برداروں کی جدوجہد، سعی و محنت، سرگرمی
عمل اور ایثار و قربانی سے ہو سکتی ہے ۔ دنیا ایک بحرِ رواں ہے، اس بحرِ
رواں میں وہی زندہ رہے گا جو خود بھی رواں ہے۔"

پھر فروری سنہ ۴۸ء میں آپ نے ارشاد فرمایا:

ہمارے صوبہ میں اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام اور اصول کی ترتیب
کے لیے جناب نواب صاحب چھتاری کی صدارت میں ایک چھوٹی سی مجلس
بنائی گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ طے پایا کہ مستند علماء اور لائق جدید تعلیم یافتہ
اہلِ علم کی باہمی معاونت سے پہلے اسلامی سیاست و اقتصاد پر ایک معتبر

کتاب تالیف کی جائے اور پھر اس میں سے اس حصہ کو الگ کیا جائے جو موجودہ زمانہ میں اور ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال میں بھی قابلِ عمل ہو .... لیکن اصل ضرورت اُن بیتاب قلوب کی ہے جو اس راہ میں سرفروشانہ آگے بڑھیں اور جو کہتے ہیں وہ کر بھی گذریں، یعنی جس اسلامی زندگی کی انہیں تلاش ہے اسکا پتہ جب پالیں تو اسکے حصول و عمل کو اپنی ہر قسم کی جد و جہد کا مرکز بنالیں"

تمام عبارات میں، قابلِ توجہ فقروں پر خط میں نے کھینچ دیے ہیں۔

ٹھیک اسی نوعیت کے خیالات تھے جو پچھلے تین چار سال سے یہ خاکسار بھی ظاہر کر رہا تھا۔ الفاظ میں، طرزِ تعبیر و انداز بیان میں، موادِ بحث اور جزئیات و فروع کے گوشوں میں فرق ضرور تھا مگر مقصد اور اسکے طریق حصول کی بنیادی تفصیلات میں یک سرِ مو فرق نہ تھا۔ دونوں بزرگوں کی مندرجۂ بالا عبارتوں کو اور خصوصاً خط کشیدہ فقروں کو غور سے دیکھیے اور ترجمان القرآن میں پچھلے تین چار سال سے جو کچھ عرض کیا جاتا رہا ہے اسے بھی بہ نظرِ غائر ملاحظہ کیجیے۔ آپکو بیّن طور پر محسوس ہوگا کہ ہمارے نظریات میں کتنی وحدت تھی۔ ایک ہی مقصد تھا جس پر یہ حضرات بھی تمام مساعی کو مرکوز دیکھنا چاہتے تھے اور میں بھی چاہتا تھا۔ اُس مقصد کے لیے کس نوعیت کی جد و جہد ہونی چاہیے اور اس جد و جہد کی خصوصیات کیا ہونی چاہییں، اِن امور میں بھی میرے اور ان حضرات کے درمیان پورا اتحادِ خیال تھا۔ یہ حضرات بھی محسوس کر رہے تھے اور میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت مسلمانوں میں کوئی منظم گروہ ایسا موجود نہیں ہے جو اُسی ایک مقصد پر اپنی مساعی کو مرکوز کر کے اِس طرز کی جد و جہد کر رہا ہو۔ اِن حضرات کو بھی یہ احساس تھا اور مجھے

بھی تھا کہ وقت کی طلب اور فرض کی پکار یہ ہے کہ ایسا ایک گروہ تیار ہو۔

اِسکے بعد کسر صرف اس چیز کی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھتا اور اس کام کے لیے صحیح اسلامی بنیادوں پر ایک عملی نظام کا خاکہ پیش کرتا اور ہم خیالوں کو پکارتا کہ آؤ، ہم اُس راہ پر چل پڑیں جس پر چلنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔

یہ کام اگر ان دونوں حضرات میں سے کسی نے کیا ہوتا، یا قابلِ اعتماد بزرگوں میں سے کسی اور[1] کی پیش قدمی کی ہوتی تو قسم بخدا کہ اُنکی پکار پر لبیک کہنے میں مجھے ذرا تامل نہ ہوتا۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکتا تھا کہ میرے دل کی تمنا بر آتی کہیں نظر آئے اور میں دوڑ کر خود نہ پہنچوں۔ تاہم اگر کوئی وجہ بے اطمینانی کی ہوتی بھی تو میرے صدقِ تمنا کا کم سے کم تقاضا یہ تھا کہ میں خاموشی کے ساتھ کام کی رفتار دیکھتا اور ہمدردانہ نظر سے دیکھتا، مجھے تلاش بے اطمینانی کے اسباب کی نہیں، اطمینان کے اسباب کی ہوتی میں دعائیں مانگتا کہ خدا کرے میرے شکوک غلط نکلیں اور میں اطمینان کے ساتھ اس کام میں شریک ہو سکوں جس کے لیے میرا اپنا دل بے چین ہے — کسی کا بچہ اگر گم ہو گیا ہو تو وہ اس بات کا یقین کرنے کے لیے ہر ممکن سہارا ڈھونڈتا ہے کہ بچہ زندہ ہے۔ بچہ کی موت کا یقین کرنے کے وجوہ سوتیلی ماں تو ضرور تلاش کر سکتی ہے، مگر حقیقی ماں اسکے لیے پتھر کا کلیجہ کہاں سے لائیگی — بہرحال میرے لیے یہ ناممکن تھا کہ اس کارِ خیر کے لیے دعوت کی پہلی آواز سنتے ہی مناع للخیر بننے پر کمر بستہ ہو جاتا۔

مئی ۴۱ء کے وسط تک میں انتظار کرتا رہا کہ جو لوگ علم میں، تقویٰ میں، تجربہ میں، سن و سال میں مجھ پر فوقیت رکھتے ہیں اُن میں سے کوئی صاحب اس کام کے لیے کوئی عملی اقدام فرمائیں اگر کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی۔ آخر کار محرم ۶۰ھ کے پرچہ میں (جو تاخیر اشاعت کے سبب سے ۲۶ مئی ۴۱ء کو شائع

[1] اب محض میری ضد میں بعض آواز اُٹھانے والوں اور بعض تحریکوں کا نام لیا جا رہا ہے مگر مجھے بہت خوشی ہوتی اگر یہ حضرات انہی میں سے کسی کے ساتھ عملاً شریک ہوگئے ہوتے۔

ہوا تھا) میں نے خود پیش قدمی کی اور جماعت اسلامی کے نظام اور پروگرام کا ابتدائی خاکہ پیش کیا۔ پھر صفر ۱۳۶۰ھ کے پرچہ میں (جو ۱۸ جولائی ۱۹۴۱ء کو شائع ہوا) میں نے یہ اعلان کیا کہ جو حضرات اس نصب العین سے اتفاق رکھتے ہیں اور اس طرز کا ایک نظام بنا کر عملی جدوجہد کرنا چاہتے ہیں وہ براہ کرم مجھے اطلاع دیں۔ میں نے شخصی طور پر کسی سے، حتیٰ کہ اپنے عزیزوں اور قریب ترین تعلقات رکھنے والوں سے بھی یہ نہیں کہا، نہ ہندوستان بھر میں کسی ایک شخص کو نجی خط لکھا کہ تم میری آواز پر لبیک کہو۔ میری حیثیت ایک موذن کی سی تھی جو نماز کا وقت دیکھ کر حی علی الصلوٰۃ کی صدا بلند کرتا ہے۔ ظاہر ہے، موذن کا یہ کام تو نہیں ہے کہ اذان دیکر ایک ایک شخص کے پیچھے بھی دوڑتا پھرے۔ اُس کا کام بس وقت پر فرض کی طرف دعوتِ عام دے دینا ہے۔ پھر جس جس میں احساس فرض ہوتا ہے وہ آپ آتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جو لوگ واقعی بے تاب تھے، جن میں واقعی تڑپ اور لگن تھی انہوں نے خود اِس پکار پر لبیک کہا۔ ان میں سارے کے سارے کم رتبہ لوگ ہی نہ تھے بلکہ وہ بھی تھے جن کو اللہ نے اچھی خاصی نام وری دے رکھی ہے۔ ان میں سب وہی نہ تھے جو پہلے سے میرے ہم خیال رہے ہوں، بلکہ وہ بھی تھے جو پہلے علانیہ پبلک میں مجھ پر سخت نکتہ چینی کر چکے تھے، جن سے میرا اختلاف کچھ ڈھکا چھپا نہ تھا۔ جب تک ان پر میرا مقصد پوری طرح نہ کھلا تھا انہوں نے برملا میری مخالفت کی۔ جب ان پر یہ بات کھل گئی کہ میں اُسی مقصد کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں جسکے وہ خود تمنائی تھے تو ان سچے حق پرستوں نے اس بات کا ذرا خیال نہ کیا کہ کل جسکی مخالفت کر چکے ہیں آج اس سے جا ملنے میں انکی سُبکی ہوگی۔ کوئی انفتہ اور حمیت جاہلیہ اور انانیت و نفسانیت انکو یہ کہنے سے باز نہ رکھ سکی کہ جب تو اقامتِ دینِ حق کے لیے سعی کرنا چاہتا ہے تو ہم تیرے ساتھ ہیں۔

اب دوسری طرف دیکھیے کہ جو حضرات وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا کے بمصداق ایک مدت سے اسی نوعیت کی ایک چیز کے لیے تمنائیں ظاہر کر رہے تھے، جو خود پتے نشان دے دے کر پکار رہے تھے کہ ایسی ایک چیز درکار ہے، اور جنہوں نے اپنے اس مطلوب و محبوب کی طرف عملاً خود کوئی اقدام نہ فرمایا تھا، اُنکے سامنے جب ایک دوسرے شخص نے وہی چیز پیش کی تو انہوں نے کیا کیا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ۲۶ رمئی ۱۹۴۱ء کو محرم کا وہ پرچہ شائع ہوا تھا جس میں میں نے اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے عملی کام کا نقشہ پیش کیا تھا۔ اِن حضرات کی خدمت میں "ترجمان القرآن" ہمیشہ حاضر ہوتا ہے۔ نظر مبارک سے یہ پرچہ بھی ضرور گذرا ہوگا۔ مگر کوئی ہمدردانہ مشورہ، کسی غلطی یا فروگذاشت پر تنبیہ، حتیٰ کہ اِس سعی کے ساتھ کسی دلچسپی کا اظہار تک نہ فرمایا گیا، نہ میرے پیش کردہ نقشہ پر کوئی تنقید کی گئی۔ میں غلط بنیاد پر تعمیر شروع کر رہا تھا تو یہ نہیں بتایا گیا کہ اِس میں یہ غلطی ہے اور صحیح یوں ہے۔ میرے متعلق اگر یہ گمان تھا کہ انکی بات نہ سنوں گا تو انکے پاس اخبار اور رسالے موجود تھے۔ میری تجویز پر علمی تنقید فرما سکتے تھے اور بندگانِ خدا کو غلط راستے سے خبردار کر کے صحیح راستہ بتا سکتے تھے۔ مگر ایسا نہ کیا گیا۔

اسکے بعد ۱۸ رجولائی کو ماہ صفر کا "ترجمان القرآن" شائع ہوا جس میں دعوتِ عام دی گئی تھی اس کا جو جواب اُدھر سے ملا وہ یہ تھا کہ ۲۸ رجولائی کے "صدق" میں شاہ نذیر احمد صاحب کا وہ مراسلہ شائع فرمایا گیا جس میں میرے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ میں اِس وقت ٹھیک اُس مقام پر ہوں جہاں اب سے پچاس پچپن برس پہلے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی تھے۔ اگر "ترجمان القرآن" کے دریا باد تک پہنچنے اور پھر "صدق" کے کتابت و طباعت کی منزلوں سے گذرنے کی مدت نکال دی جائے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جناب مولانا عبدالماجد صاحب نے اس دعوت کی آواز سماعت فرمانے

اور عملاً مخالفت شروع کر دینے کے درمیان پورا ایک ہفتہ بھی غور و تأمل میں صرف نہ فرمایا۔ بالفرض اگر میری دعوت مشتبہ بھی تھی (اور زیادہ سے زیادہ وہ اس کو مشتبہ ہی کہہ سکتے ہیں، صریح دعوت ضلالت ہونے کا ثبوت تو اب بھی انکے پاس نہیں ہے) تو کیا اعلائے کلمۃ اللہ کی لگن اور تڑپ رکھنے والے لوگ ایک ایسی سعی کے معاملہ میں، جسکے اندر محض برسرِ باطل ہونے ہی کا نہیں بلکہ کچھ برسرِ حق ہونے کا امکان بھی ہو، بالفعل مخالفت شروع کر دینے کا فیصلہ اتنی ہی عجلت کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟

اس دعوت کے آغاز سے کچھ ہی مدت پہلے تک مولانا مدظلہ اس خاکسار کے متعلق جو خیالات ظاہر فرماتے رہے ہیں اسکے اعادہ کی یہاں حاجت نہیں۔ "مسیح" اور "صدق" کے گذشتہ سات آٹھ برس کے فائل گواہ ہیں کہ یہ ہیچ میرزا انکی نگاہ میں کیا تھا۔ پھر جو لوگ میرے ساتھ ہیں، محمد منظور صاحب، امین احسن صاحب، ابوالحسن علی صاحب، سید ضیغتہ اللہ صاحب، مسعود عالم صاحب، سید محمد جعفر صاحب، ان میں سے کون ایسا ہے جسکے متعلق کوئی اللہ کا بندہ اللہ کو سمیع و بصیر سمجھتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہو کہ یہ لوگ کبھی اہل زیغ و ضلال میں سے رہے ہیں، یا فتنے کی طرف کبھی ان کا میلان رہا ہے، یا علمی و عملی بدراہیوں میں یہ بھٹکتے رہے ہیں۔ طبقۂ اولیٰ میں نہ سہی، طبقۂ ثانیہ میں تو شاید ان لوگوں کا شمار اس وقت ہندوستان کے بہترین اشخاص میں ہو سکتا ہے۔ پھر جس عقیدے، جس نصب العین، اور جس نظام جماعت پر ہم نے کام کی بنیاد رکھی ہے اور جماعت کی تشکیل کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں جزئی فروگذاشتیں ممکن ہے کہ ہوں، مگر غالباً کسی صریح ضلالت کی نشان دہی تو نہیں کی جا سکتی۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر چند ایسے آدمی جو پہلے سے خود آپ کی نگاہ میں قابلِ اعتبار رہے ہیں، اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کوئی اقدام کریں تو اس میں فتنہ کا شبہ کرنے کے لیے خواہ کتنی ہی گنجائش ہو، کیا اسکے برسرِ حق ہونے کا سرے سے کوئی امکان ہوگا

ہی نہیں ؟ ضد اور ہٹ دھرمی کی بات تو دوسری ہے، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم اپنی آبائی جائداد کا مقدمہ لڑنے نہیں اٹھے ہیں بلکہ اُسی حق کی سربلندی چاہتے ہیں جو آپکی نگاہ میں بھی حق ہی ہے تو اس میں قدم قدم ضد آخر کونسا موقع ہے۔ پس اگر ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ہمارے اقدام کو مشتبہ ہی کہا جاسکتا ہے، اور صحیحاً باطل نہیں کہا جاسکتا، پھر کیا خدا سے ڈرنے والے نفوس زکیہ کا یہی کام ہے کہ جس سعی میں خیر و صلاح کا کچھ بھی امکان پایا جاتا ہو، اسکی مخالفت میں اتنی جلد بازی دکھائیں ؟

اس سوال کو یہیں چھوڑیے، اور تاریخی سلسلۂ بیان کے ساتھ آگے چلیے۔

۱۸ر جولائی ۱۹۴۱ء کے "صدق" میں شاہ نذیر احمد صاحب کا مذکورۂ بالا مراسلہ شائع تو کردیا گیا، مگر اُس وقت تک مولانا اسکے لیے تیار نہ تھے کہ جس شخص کو اب تک قامع فتن کہتے رہے ہیں اُسے اب یکایک منبع فتن قرار دے دیں چنانچہ اس خط پر جو نوٹ انہوں نے تحریر فرمایا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"صدق میں اسکے شائع ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خود صدق کو بھی اس سے لفظاً لفظاً اتفاق ہو۔ خصوصاً جہاں مولانا کی مثال مرزا صاحب قادیانی سے دی گئی ہے وہ مقام تو بہتوں کو کھٹکے گا۔ اور یوں بھی مولانا اب تک جو گراں بہا دینی خدمات انجام دے چکے ہیں ان کے لحاظ سے ان پر کوئی نکتہ چینی کرتے قدرۃً دل دُکھتا ہے"

میں نہیں کہتا کہ مولانا کا مقصد یہ تھا، مگر بالفعل اس کا حاصل یہی نکلا کہ میری طرف سے دلوں میں ایک خطرناک وسوسہ بھی ڈال دیا گیا اور اس وسوسہ کی اشاعت کرنے والے بزرگ خود

(بقیہ بر صـ ۹۱)

(بقیہ اشارات) بری الذمہ بھی ہو گئے۔

اس مراسلہ کے جواب میں میں نے مولانا عبدالماجد صاحب کی خدمت میں دو عریضے لکھے (جنکا خلاصہ یکم ستمبر ۴۱ء کے صدق میں شائع بھی ہو چکا ہے) جن میں شاہ صاحب کے عائد کردہ الزامات کی تردید کی اور ساتھ ہی خود ان شاہ صاحب کی حقیقت سے بھی مولانا کو آگاہ کر دیا تاکہ اگر وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر ان کے دام میں پھنس رہے ہیں تو آگاہ ہو جائیں۔

[مجھے ان شاہ صاحب سے کوئی ذاتی عداوت نہ پہلے کبھی تھی، اور نہ انکی پے در پے زیادتیوں کے باوجود اب کوئی عداوت ہے۔ مگر فی الواقع انکی سیرت کو میں سخت ناقابلِ اعتماد سمجھتا ہوں۔ جو صاحب کبھی تو مولانا حسین احمد صاحب کو معاذ اللہ بدترین جانوروں سے تشبیہ دیں اور مولانا ابوالکلام کو بے یقین اور استقامت فی الدین سے محروم قرار دیں، اور کبھی انہی حضرات کے متعلق یہ لکھیں کہ "حضرت مولانا حسین احمد صاحب جیسے آدمی اپنی ہمت و عزم اور جناب مولوی ابوالکلام صاحب اپنی فراست کے باعث اِس مقصد دینی کی قیادت کے ایسے اہل ہیں کہ کم از کم ہندوستان میں ایسے دو آدمیوں کا ملنا مشکل ہے"، جو صاحب ۲۲ اکتوبر کو میرے لیے "مدعی کاذب" "جاہل مرکب" اور "محارب خدا" کے الفاظ لکھیں اور ٹھیک دس روز بعد ۳ نومبر کو میرے ایک رفیق قمرالدین خاں صاحب کے نام اپنے خط میں یہ فرمائیں کہ "موجودہ زریں موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے خیری صاحب اور مودودی صاحب سے زیادہ موزوں آدمی نظر نہیں آتے ..... اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ امت کو دین پر تعمیر کرنے کی تم کونسی تجویز بتاتے ہو تو میری عرض یہ ہے کہ میں مودودی صاحب کو مستقل قیام علی گڈھ میں کرنے کی دعوت دونگا" کیا اُن کی سیرت پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اب مولانا عبدالماجد صاحب فرماتے ہیں کہ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔ مگر میں عرض کرتا ہوں کہ اِذَا جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا]

جماعت کی تشکیل سے پہلے تک معاملہ صرف نذیر احمد صاحب کے مراسلہ اور میرے جواب کی اشاعت تک چل کر ختم ہو گیا تھا۔ اگست کے آخر میں جب جماعت قائم ہو گئی، اور اسکے قیام کی اطلاع بمع دستور جماعت ربیع الاول کے ترجمان القرآن میں (جو ۲۰ ستمبر ۱۹۴۱ء کو شائع ہوا تھا) نکل گئی تو مولانائے محترم نے ۲۹ ستمبر سے نذیر احمد صاحب کے اُن مراسلات کی اشاعت شروع کر دی جو میرے خلاف ہر قسم کے بے سروپا الزامات اور بدترین حملوں سے لبریز تھے۔ پھر ۲۰ اکتوبر سے خود بھی اظہار خیال شروع کیا، مگر نہایت وضع احتیاط کے ساتھ یہ کوشش کرتے رہے کہ کھلم کھلا مخالفت سے پرہیز کریں۔ البتہ قصداً یا بلا قصد (اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے) انہوں نے اُن وساوس کو تقویت پہنچانے میں کوئی کمی نہ فرمائی جو "صدق" ہی کے دوسرے کالموں میں نذیر احمد صاحب پورے دھڑلے سے پے در پے ناظرین "صدق" پر القا فرما رہے تھے۔ چنانچہ ۲۰ اکتوبر کے "صدق" میں جماعت اسلامی کے دستور اور رپورٹ پر نوٹ لکھا جس میں بعض چیزوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لیکن ساتھ ہی بعض دوسرے پہلو بھی ہیں جو بہت کچھ محل گفتگو ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دین کو بحیثیت مجموعی دین کی نہیں[1] بلکہ ایک تحریک کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اندیشہ ہے، اور یہ اندیشہ مولانا محمد منظور جیسے مخلص و متدین بزرگوں کی شرکت کے باوجود باقی ہے کہ کہیں یہ خود ایک مستقل فتنہ کی صورت نہ اختیار کر لے۔ بعض اور خدشے بھی اچھے خاصے موجود ہیں۔"

اس نوٹ کے نیچے ملک کے کسی "مشہور صاحب علم و صاحب قلم بزرگ" کے گرامی نامہ سے ایک اقتباس نقل فرماتے ہیں جس میں میرا استہزاء کیا گیا تھا اور جماعت اسلامی کی تشکیل کو ایک طفلانہ کھیل کی حیثیت دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

[1] یہ "دین کی نہیں" کا فقرہ قابل غور ہے۔ محض لفظ تحریک کے استعمال (۲۹) پر مولانا کا اعتراض پوری طرح چسپاں نہ ہو سکتا تھا اسلیے دین کا نفی

۱۰ نومبر کے "صدق" میں پھر ایک نوٹ لکھتے ہیں جس کا انداز یہ ہے کہ میں تو کچھ کہتا نہیں ہوں، مخالفت یا اعتقاد میں غلو سے پرہیز کرتا ہوں، مگر اس شخص اور اس جماعت کے کام کے متعلق لوگ یہ اور یہ کہتے ہیں۔ اور وہ کہتے کیا ہیں؟ یہ کہ مودودی اور فرقہ اہل قرآن (یعنی منکرین حدیث) دونوں سے نوجوان گمراہ ہو رہے ہیں۔ یہ کہ مودودی کے افکار "ہرگز نتیجۂ تدبر فی القرآن نہیں بلکہ نتیجۂ تدبر فی السیاسیات الحاضرہ اور ثمرۂ تفکر تشریعات اروپا ہیں جس پر کھینچ تان کر قرآن کو زبردستی منطبق کیا جا رہا ہے"۔ یہ کہ اس شخص کے معاملہ میں ہرگز نرمی نہ برتی جائے ورنہ اسی طرح پیچھا نا پڑیگا جس طرح اقبال مرحوم پچھتائے تھے کہ پہلے قادیانیوں کی پیٹھ ٹھونکی اور آخر میں اس فرقہ کے استیصال کی ناکام کوشش کی۔

حقیقت کا علم صرف خدا کو ہے۔ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا نے یہ نقشۂ جنگ ضرور سمجھ بوجھ کر ہی بنایا تھا۔ مگر ۲۹ ستمبر سے ۸ دسمبر تک کے صدق کے پرچے مسلسل پڑھتے ہوئے کچھ نقشہ تو اس طرح کا نظر آتا ہے کہ آگے ایک غیر ذمہ دار آدمی کھڑا ہے جو شتر بے مہار کی طرح بے خوف و خطر ہر سہل و صعب پر چڑھتا اترتا چلا جاتا ہے اور کسی جھوٹ، کسی بہتان، کسی افترا اور جعل کے ارتکاب میں اسے باک نہیں ہے۔ اسکے پیچھے نامعلوم الاسم فضلاء و خدام دین کے خطوط کی ایک فوج ہے جو مقدمۃ الجیش کو کمک پہنچا رہی ہے۔ اور ان سب کے پیچھے خود حضرت صاحبِ "صدق" پوری شان احتیاط و تقویٰ کے ساتھ غلو اور افراط سے دامن بچاتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ہاں صاحب! کچھ دال میں کالا تو ہے، فتنہ کا ڈر تو ضرور ہے، کچھ پہلو محل گفتگو بھی ہیں، اور بعض اور خدشے بھی ہیں!

اس پوری مدت کے صدق کے پرچے نکال کر دیکھ لیجیے، مولانا عبدالماجد صاحب نے خود دال میں سے ایک کالا بھی نکال کر نہیں بتایا، نہ کسی فتنہ کی تفصیل ارشاد فرمائی، نہ کسی محلِ گفتگو پر گفتگو کی، نہ کسی اور خدشے پر روشنی ڈالی۔ بس کہا تو یہ کہا کہ "دین کو تحریک کی صورت میں پیش کیا گیا ہے"۔ یعنی

اعتراض یہ تھا کہ مسجد کی تعمیر تو ٹھیک ہے مگر غضب یہ کیا گیا ہے کہ اسے "کنسٹرکشن" کہدیا گیا۔ بھلا کہیں مسجد کا کنسٹرکشن بھی ہوتا ہوگا؟ پہلے کبھی کسی نے ایسی ثقیل حرکت کی ہے؟

لطف یہ ہے کہ اس اصطلاح کے استعمال میں تنہا میں ہی متفرد نہیں ہوں۔ اسلام اور اسکی تبلیغ اور اسکے قیام کی جدوجہد کے لیے مولانا سید سلیمان صاحب، مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، سب ہی "تحریک" کا لفظ استعمال کرتے رہے ہیں۔ ارشاد ہوگا تو عبارتیں نقل کردونگا۔ البتہ مجھے اپنا گناہ اسکے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ جسے تحریک کہا جارہا تھا اسکو میں نے عملاً شروع کردیا۔

جناب مولانا عبدالماجد صاحب بات یہاں تک پہنچا چکے تھے کہ اس ماحول میں نومبر ۱۹۱۸ء کا "معارف" نکلا جسکے "شذرات" میں حضرت سید صاحب قبلہ نے کچھ اہلِ عقل و اہل نقل کے طریق کار کا فرق بیان کرتے ہوئے یہ ثابت فرمایا تھا کہ متکلمین ہر زمانہ میں اپنے وقت کی چلتی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اسلام کو انہی کے سانچہ میں ڈھالتے رہے ہیں اور "اب اِس زمانہ کے متکلم اسلام ایک تحریک کا نام رکھ کر" اسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ بظاہر اس گفتگو کے لیے کوئی تقریب اُس وقت نظر نہ آتی تھی۔ اب بھی کوشش کے باوجود میں یہ معلوم نہیں کرسکا ہوں کہ اس کے لیے کونسی خاص تقریب ہوسکتی تھی۔ اور سید صاحب کے متعلق یہ تو گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ یونہی کیف ما اتفق کچھ فرما دیتے ہونگے۔ لہذا خیال اسی طرف گیا، اور ایک میرا ہی خیال نہیں، بہتوں کا خیال اِس طرف گیا کہ "صدق" میں دین کو بشکل جمود نہیں بلکہ بشکل "تحریک" پیش کرنے والوں پر جو لے دے ہو رہی ہے، یہ لمز بھی انہی کی جانب ہے۔

اب بھی سید صاحب یہ نہیں فرماتے کہ ان کی مراد وہ نہ تھی جو سمجھی گئی۔ بلکہ فرماتے یہ ہیں

کہ خدا جانے ایسا کیوں سمجھ لیا گیا - بے شک، خدا تو جانتا ہی ہے اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ -

---

دسمبر کے وسط تک میں صبر و سکون کے ساتھ یہ صورتِ حال دیکھتا رہا - آخر کار جب میں نے دیکھا کہ مسلمانوں میں سے جو طبقہ اللہ کے نام پر اللہ کے کام کے لیے اٹھ سکتا ہے وہی اِن بدگمانیوں کی اشاعت سے مسموم ہو رہا ہے، اور بیشتر گفتگوؤں اور خطوط میں وہی شبہات بار بار سامنے آ رہے ہیں جو اس دوران میں پھیلائے گئے ہیں تو مجبوراً میں نے اپنے اُس خط کو رسالہ میں درج کیا جو گذشتہ اشاعت میں "رفعِ شبہات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے - اسکو پھر ایک دفعہ ملاحظہ فرما لیا جائے - کیا اس میں کہیں کوئی چیلنج ہے؟ کوئی دعوتِ مبارزت ہے؟ سیدھی صاف بات عرض کی گئی ہے کہ معاملہ اللہ کے دین کا ہے، ہم اس نازک وقت میں اپنا فرض محسوس کر کے اس کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، خوب سوچ سمجھ کر جو طریقہ خدمتِ دین کا ہم اختیار کر سکتے تھے وہ ہم نے کیا اگر ہم نے کوئی غلطی کی ہے تو ہمیں دلیل و محبت کے ساتھ صاف صاف بتایا جائے کہ کہاں کیا غلطی ہے، اور جو کچھ صحیح ہے وہ بھی دلیل سے بتا دیا جائے، اور اگر یہ نہیں کیا جاتا تو خواہ مخواہ لفظی گرفتوں سے، خوردہ گیریوں سے اور وسوسہ اندازیوں سے صدعن سبیل اللہ کی کوشش نہ کی جائے -

توقع تھی کہ اسکے جواب میں ادھر کچھ خدا کا خوف، کچھ ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا - اگر واقعی کوئی اصولی اختلاف ہے تو اسے معقول طریقہ سے پیش کیا جائیگا - نہیں ہے تو اس بابِ ہمز و لمز کو بند کر دیا جائیگا - مگر افسوس کہ یہ توقع پوری نہ ہوئی -

---

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے معارف میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس سے ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ میری گذارش کو انہوں نے مجادلہ کے رنگ میں ملاحظہ فرمایا، حالانکہ میرا مقصد مجادلہ ہرگز نہ تھا۔ میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ایا انہیں اعتراض محض لفظ تحریک کے استعمال پر ہے یا اُس کام پر ہے جو "تحریک" کے نام سے کیا جا رہا ہے۔ پہلی صورت ہے تو ایسی چھوٹی باتوں میں نظر کو الجھانا انکے مرتبہ سے فروتر ہے، اور دوسری صورت ہے تو بلا تکلف اپنے اعتراض کی تفصیل ارشاد فرمائیں۔

سید صاحب محترم خود اس سے پہلے ایک ایسی "تحریک و دعوت" کی ضرورت ظاہر فرما چکے ہیں جو اسلام کا مکمل سیاسی و اقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کرنے اور اس نظام کو قائم کرنے کے لیے اٹھے۔ وہ خود فرما چکے ہیں کہ "آج زمانہ بدل گیا ہے تو اصطلاحیں بدل گئی ہیں"۔ وہ خود لکھ چکے ہیں کہ آج کی تمام مشکلوں کا حل قرآن و سنت میں ہے مگر "ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے"۔ انہوں نے خود جون ۱۹۴۱ء کے "معارف" میں ان لوگوں کی مدح و تحسین فرمائی ہے جو "اسلامی تخیل اور اُسکی عالمگیر تحریک کی حقیقت سمجھنے اور زمانۂ حال کی زبان میں اسکی تعبیر اور فہم و تفہیم کے لیے بیتاب ہیں" اور لکھا ہے کہ "جس طرح تاریخ کے پچھلے دوروں میں اسلام کے لیے حسب ضرورت علم کلام کے مختلف نقشے بنتے اور بگڑتے رہے اُسی طرح یہ زمانہ بھی اسلام کے لیے ایک نئے علم کلام کا مقتضی ہے جس کا مقصد اجتماعی، سیاسی و اقتصادی تنظیمات میں اسلام کی صحیح رہبری ہو"۔ وہ خود اُس مجلس نظام اسلامی کے صدر ہیں جو انکے اپنے ارشاد کے مطابق "اسی اقتضاء حال کی تعمیل ہے"۔ وہ خود ابھی ایک ہی مہینہ پہلے دسمبر ۱۹۴۱ء کے "معارف" میں لکھ چکے ہیں کہ "موجودہ زمانہ میں اسلامی تعلیمات اور اسکے نظام کو جدید طرز میں اس طرح پیش کرنا جو دوسری قوموں اور جدید طبقہ کے لیے بھی قابل توجہ ہو، ایک مفید خدمت ہے"۔ انکی اپنی پوری زندگی کا کارنامہ اس بات پر شاہد ہے کہ وہ اسلام کے حقائق و مسائل کو "اہلِ نقل" کی زبان اور طرز میں نہیں بلکہ "متکلمین عصر"

کے ڈھنگ ہی پر پیش کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا وہ اس فعل کو بجائے خود تو جرم قرار نہیں دے سکتے، البتہ جرم اگر کسی چیز کو کہہ سکتے ہیں تو وہ "تعبیر حقائق" سے گذر کر "تغییر حقائق" تک پہنچ جانا اور "عارضی مصالحت اور ہنگامی تطبیق کی خاطر" دین کے حقائق و مسائل کی تعبیر و ترجمانی اس طرح کرنا ہے کہ وہ "اطفال عقلی کا بازیچہ بن جائے اور اسکی اپنی اصل مستقل حیثیت کے بجائے دوسروں کے ضمیمہ کی ہو جائے"۔ میں نے اسی آخری چیز کو "تجدد" سے اور پہلی چیز کو "تجدید" سے تعبیر کیا تھا۔ تفعیل و تفعل کی بحث لاحاصل ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ "اسلام ایک تحریک" کا نام رکھ کر کام کرنے والے پہلی چیز کے قصوروار ہیں یا دوسری کے؟

"تجدید" کا لفظ سنتے ہی مولانا محترم کا ذہن جس طرف منتقل ہوا ہے وہ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> "حضرت مجیب تجدد کے مجرم ہوں یا نہوں لیکن جناب مجیب بزعم خود دعوائے تجدید کے مجرم تو علانیہ اپنے قلم سے ہو رہے ہیں، کیونکہ وہ اپنے مقالات فقہی، مسائل کلامی اور رسائل سیاسی کو تجدید گمان کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان کے یہ چند سالہ کارنامے تجدید دین ہیں تو وہ اس صدی کے مجدد بننے کے بھی مدعی بن رہے ہیں"۔

اس قسم کے الزامات کی اشاعت بعض پست ذہنیت رکھنے والے لوگ تو اس سے پہلے کر رہے تھے، اور میں انکے ظلم پر صبر و سکوت ہی مناسب سمجھتا تھا، مگر اب یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ سید صاحب جیسے سنجیدہ بزرگ بھی ایسی باتوں پر اتر آئے ہیں۔ میرے الفاظ سے خود اپنی مراد نکالنے کے لیے اگر وہ اتنے بے صبر نہ ہوتے تو ان پر میری مراد خود واضح ہو جاتی۔ جس کام کی کچھ تفصیلات

ابھی میں نے مولانا کے اپنے الفاظ میں اوپر نقل کی ہیں وہ دراصل تجدیدی نوعیت ہی کا کام ہے۔ دینِ حق کو جاہلیت کی آمیزشوں سے جدا کرکے اسکی اصلی صورت میں پیش کرنا، اسکی بنیادی صداقتوں میں ردوبدل کیے بغیر اسکو ایسی حکمت کے ساتھ پیش کرنا کہ اہلِ زمانہ کے دل و دماغ اس سے متأثر ہوسکیں، "نئی نظر اور نئی قوت" سے کام لیکر قرآن و سنت سے وقت کے مسائل کا حل تلاش کرنا، علمی و عملی اور اخلاقی و روحانی طاقتوں سے جاہلی نظامات کے تسلط کو مٹانے اور اُنکی جگہ اسلامی نظام کو دنیا میں قائم کرنے کی کوشش کرنا، یہ سب تجدیدی نوعیت ہی کے کام ہیں۔ کوئی شخص یا کوئی گروہ یا کوئی ادارہ خواہ بڑے پیمانے پر یہ کام کرے یا چھوٹے پیمانے پر، اور اس سلسلہ میں کوئی بڑی خدمت انجام دے جائے یا کچھ تھوڑی سی خدمت انجام دے کر رہ جائے بہرحال اس کا کام تجدیدی کام ہی کہا جائیگا، اور ظاہر ہے کہ جو کوئی اس کام کو کریگا اس میں یہ شعور بھی ہوگا کہ وہ یہ کام کر رہا ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو تجدیدی کام کرے وہ مجدّد کے لقب سے بھی ملقّب ہو، صدی کا مجدّد ہونا تو اس سے بلند تر بات ہے۔ اینٹیں چن کر دیوار بنانا بہرحال ایک تعمیری کام ہے، مگر کیا یہ لازم ہے کہ جو چند اینٹیں چُن دے وہ "انجینیر" بھی کہلائے اور پھر انجینیر بھی معمولی نہیں بلکہ اپنی صدی کا انجینیر؟ اسی طرح کسی کا اپنے کام کو تجدیدی کام یا تجدیدی کوشش کہنا، جبکہ فی الواقع وہ تجدید دینِ حق ہی کی غرض سے یہ کام کر رہا ہو، محض ایک امرِ واقعہ کا اظہار ہے اور اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مجدّد ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور اس صدی کا مجدد بننا چاہتا ہے۔ کم ظرف لوگ بے شک تھوڑا سا کام کرکے اونچے اونچے دعوے کرنے لگتے ہیں، بلکہ کام کا ارادہ ہی دعوے کی شکل میں کرتے ہیں، لیکن کسی ذی فہم آدمی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کام کرنے کے بجائے دعوے کریگا۔ تجدید دین کا کام ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ خود مولانا سید سلیمان صاحب کو بھی ہم انہی میں شمار کرتے ہیں۔ میں نے

بھی اپنی حد استطاعت تک اس خدمت میں حصہ لینے کی سعی کی ہے اور اب ہم چند خدام دین ایک جماعت کی صورت میں اسی کے لیے کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ جس کے کام میں بھی اتنی برکت دے کہ واقعی اسکے ہاتھوں دینِ حق کی تجدید ہو جائے وہی درحقیقت مجدد ہو گا۔ اصل چیز نہ آدمی کا اپنا دعویٰ ہے نہ دنیا کا کسی کو مجدد کے لقب سے یاد کرنا، بلکہ اصل چیز آدمی کا ایسی خدمت کر کے اپنے مالک کے حضور میں پہنچنا ہے کہ وہاں اسے مجدد کا مرتبہ حاصل ہو۔ میں مولانا کے حق میں اسی چیز کی دعا کرتا ہوں، اور بہتر ہو کہ وہ بھی "عنقارا بلند است آشیانہ" کہنے کے بجائے دوسروں کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ ان سے اپنے دین کی ایسی کوئی خدمت لے لے۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض اسلامی الفاظ کو خواہ مخواہ ہوا بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی رومی عظمت کی تجدید کا داعیہ لیکر اٹھتا ہے اور رومیت کے پرستار اس کو مرحبا کہتے ہیں۔ کوئی ویدک تہذیب کی تجدید کا عزم کر کے اٹھتا ہے اور ہندویت کے پرستار اسکی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔ کوئی یونانی آرٹ کی تجدید کے ارادہ سے اٹھتا ہے اور آرٹ کے پرستار اسکی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ کیا ان سب تجدیدوں کے درمیان صرف ایک خدا کے دین کی تجدید ہی ایسا جرم ہے کہ اس کا نام لیتے ہوئے آدمی شرمائے اور اگر کوئی اسکا خیال ظاہر کر دے تو اللہ کے پرستار اس کے پیچھے تالی پیٹ دیں؟

مولانا عبدالماجد صاحب کی خدمت میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا اس کا فائدہ بس یہ ہوا کہ جو باتیں وہ خود تحریر فرمانے سے اب تک پرہیز کر رہے تھے اب انہوں نے بے تکلف لکھنی شروع کر دی ہیں۔ میں ان کے جواب میں انشاء اللہ کچھ عرض نہ کرونگا۔ برسوں وہ میرے حق میں کلمات خیر لکھتے رہے ہیں۔ اب وہ مذمت فرمائیں تو انہیں اسکا پورا حق ہے۔ کم از کم سات آٹھ برس میں تو کہیں پچھلا قرض ہی ادا ہو پائیگا۔ اور ویسے بھی وہ اس وقت ماشاء اللہ جنگ برگی گری دگوریلا وار فیر کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔ ان سے لڑ کر جیت

کون سکتا ہے۔ باقاعدہ علمی تنقید کر کے بیک وقت کبھی نہ بتائینگے کہ فلاں شخص اتنا ہدایت پر اور اتنا ضلالت پر ہے، یا پورا کا پورا ضلالت ہی پر ہے اور ان دلائل سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ نہیں، اسکے برعکس وہ تمام عمر ایک فقرہ اور دو لفظ فی ہفتہ کے حساب سے منتشر طور پر نکال نکال کر اُس پر لوگوں سے جذباتی اپیل کرتے رہینگے۔ تو جس شخص کو اپنی زندگی اپنی کاموں میں گذار دینی ہو اور بعد کے حساب کتاب کی کچھ فکر نہ ہو وہ تو ان کے ساتھ اس مشغلہ میں حصہ لے سکتا ہے۔ ورنہ جسے اس بات کا بھی کچھ خیال ہو کہ زندگی کی یہ مہلت ختم ہو جانے کے بعد کہیں یہ نہ کہنا پڑے کہ یٰلَیْتَنِی قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ، اُسکے لیے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ انکی خدمت میں سلام عرض کرے اور اپنے کام میں لگ جائے۔ لہذا اس بیرگی گری کے مقابلہ میں اس تحریر کو میری طرف سے آخری جواب اور ہمیشہ کے لیے جواب سمجھنا چاہیے۔

البتہ انکی خدمت میں اتنی گذارش اور ہے کہ جماعت اسلامی اور اسکے کام کو میرے ساتھ خلط ملط نہ کر دیں۔ جماعت واقعی صالح، نیک نیت اور خدا ترس لوگوں سے بنی ہے۔ ان میں کوئی مجھ پر ایمان نہیں لایا ہے۔ ان میں کوئی ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات پر تیار نہیں ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں کسی کمی یا بیشی کو کسی کی طرف سے برداشت کر لے۔ ان میں متعدد ایسے لوگ موجود ہیں جو اس دین کے اندر باریک سے باریک غیر دینی آمیزش کا بھی انشاء اللہ پتہ چلا لینگے اور صرف اس آمیزش ہی کو چھانٹ دینے پر اکتفا نہ کرینگے بلکہ آمیزش کرنے والے کا بھی گلا دبوچ لینگے، چاہے وہ ان کا لیڈر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ سب محض دین حق کا بول بالا کرنے جمع ہوئے ہیں۔ آپ ان کی راہ نہ روکیں۔ بس میرے عیوب ان پر واضح کر دیجیے۔ یہ کل ہی مجھے معزول کر کے دوسرا لیڈر منتخب کر لینگے۔ کوئی دوسرا بہتر آدمی ان کے اندر آجائے تب بھی انہیں اُسکو مجھ سے بدل لینے میں تامل نہ ہوگا جب میری ان کے درمیان یہ حیثیت ہے، جب میں انکے نزدیک نہ امام معصوم ہوں نہ معاذ اللہ بانی مذہب کہ بدلا نہ جا سکوں، تو آپ میرے ساتھ خواہ مخواہ ان بیچاروں کو کیوں لپیٹ میں لے

لیں؟ میرے متعلق الگ اظہار خیال کیجیے۔ جماعت کے متعلق الگ۔ جماعت کے سلسلہ میں فیصل طلب سوال صرف یہ ہے اور اسی کا جواب ٹھنڈے دل سے عنایت ہو کہ جس عقیدے، جس نصب العین اور جس نظام و دستور پر یہ جماعت بنی ہے، اور جو طریق کار اس نے اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لیے اختیار کیا ہے اسکو آپ صحیح سمجھتے ہیں یا غلط؟ اگر صحیح ہے تو کم سے کم ایک دین دار آدمی سے یہ توقع ہے کہ وہ دل سے اس کا بھلا چاہے گا اور اس کے حق میں بھلائی کی دعا کرے گا۔ اگر غلط سمجھتے ہیں تو جو کچھ غلطی آپ اس میں پاتے ہیں اسے واضح طور پر بتا دیجیے، اور مناسب سمجھیں تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیجیے کہ صحیح کیا ہے۔ یا اگر سرے سے یہ بالکل ہی غلط ہے تو اس چیز کی کچھ تفصیل ارشاد ہو جو آپ کے نزدیک اسکے بجائے ہونی چاہیے۔

ہمارا کتب خانہ

الجہاد فی الاسلام قیمت بے جلد چار روپے مجلد پانچ روپے

رسالہ دینیات (اردو) قیمت بے جلد بارہ آنے مجلد ایک روپیہ

سیاسی کشمکش حصہ اول قیمت بے جلد آٹھ آنے (۸ر)

" " دوم قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے (۱ر۸)

" " سوم قیمت بے جلد ایک روپیہ (۱ر)

مسئلہ قومیت قیمت بے جلد بارہ آنے (۱۲ر)

تنقیحات قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے مجلد دو روپے (۱ر۸)

پردہ قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے مجلد دو روپے۔ (۱ر۸)

خطبات قیمت بے جلد ایک روپیہ آٹھ آنے مجلد دو روپے

سلامتی کا راستہ قیمت ایک عدد تین آنے (۳ر)

اسلام کا نظریہ سیاسی قیمت ایک عدد ۳ آنے (۳ر)

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے قیمت ایک عدد (۳ر)

اسلام اور جاہلیت قیمت ایک عدد تین آنے (۳ر)

نیا نظام تعلیم قیمت ایک عدد تین آنے (۳ر)

تجدید و احیاء دین قیمت ایک عدد آٹھ آنے (۸ر)

ایک اہم استفتاء قیمت ایک عدد ایک آنہ (۱ر)

ملنے کا پتہ:- دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور